بشیر احمد ڈار

یہودی تصوّف

یہودیوں کے ہاں ظاہری رسوم کی پابندی اتنی اہم سمجھی جاتی تھی کہ عام طور پر یہ خیال پیدا ہوگیا ہے کہ تصوف کا جو اپنی اصلی روح کے لحاظ سے ظاہریت کا دشمن ہے یہودیوں کے ہاں پایا جانا ممکن نہیں۔ چنانچہ ورثۂ اسرائیل ([illegible]) کے مضمون "یونانی یہودیت" کے مصنف کا خیال ہے کہ عہد عتیق میں صوفیانہ خیالات بالکل ناپید ہیں اور جہاں کہیں فیلو (Philo) نے اپنے صوفیانہ تجربات اور واردات کا ذکر کیا ہے تو وہ یونانی حکمت اور خاص کر افلاطون کے نظریات کا چربہ اور ان کی نقل ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے: "جب فیلو صوفیانہ تجربات کا ذکر کرتا ہے تو اس کی زبان اور اس کے الفاظ صاف صاف افلاطون کے مکالمات سمپوزیم اور فیڈرس کی یاد دلاتے ہیں۔ ارسطو کے نزدیک بھی انسان کی اکملیت کا اظہار اخلاقی اعمال میں نہیں ہوتا بلکہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ ذاتِ مطلق کا مشاہدہ کر رہا ہو ہے اور اس حالت میں اس کا عمل خدائی عمل کے مماثل ہوتا ہے اور ——— فیلو اس معاملہ میں یہودی نہیں، یونانی ہے"[1]۔ لیکن یہ محض مبالغہ آمیزی ہے۔ تصوف اور مذہب کسی خاص قوم یا نسل یا ماحول کی پیداوار نہیں۔ اور اس معاملہ میں یونانیوں کا کوئی حقِ اولیت ثابت نہیں ہو سکتا۔ یہ محض مغربی تعصب کا ایک ہلکا سا نمونہ ہے۔ مذہب جہاں شریعت کی پابندی کا تقاضا کرتا ہے وہیں وہ روح کی اندرونی آواز اور جذبات کی شدت کے اظہار سے بھی مانع نہیں۔ بلکہ تاریخی طور پر تو معلوم ہوتا ہے کہ جہاں مذہب میں ظاہر پرستی زیادہ ہوتی گئی وہاں انسان اپنی فطرت کے صحیح اظہار کے لیے صوفیانہ کیفیات کی دلچسپیوں کی طرف زیادہ سے زیادہ راغب ہوتا گیا۔

خود عہد عتیق کے مختلف نوشتوں کا مطالعہ کیا جائے تو اس حقیقت کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ کوئی مذہب انسان کے داخلی تجربات اور صوفیانہ وارداتوں سے خالی نہیں بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کی حقیقی روح اور اس کا مغز انہی تجربات اور وارداتوں پر منحصر ہے۔ ورثۂ اسرائیل کے مذکورہ بالا مضمون نگار[2] کا کہنا ہے کہ ان نوشتوں

---

[1] ورثۂ اسرائیل۔ آکسفورڈ پریس ۱۹۴۸ء۔ صفحہ ۴۷

[2] ڈاکٹر ایڈون۔ آر۔ بیون۔

کی رُو سے مذہبی زندگی کا بہترین نمونہ یہ ہے کہ انسان روزمرہ کی عملی زندگی میں اپنے افعال و اعمال کو خدا کی رضا کے مطابق ڈھالے اور اس کا بلند ترین مقصد رضائے الٰہی کا حصول ہو۔ لیکن اس کے باوجود بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ صوفیانہ طریقہ زندگی جس میں واردات و تجربات شامل ہیں کس طرح اس طریقۂ زندگی سے متنازہ ہیں۔ کیا ایک صوفی اپنے انفرادی اعمال کو خدا کی رضا کے ساتھ وابستہ نہیں کر سکتا یا کرتا؟ آخر ان دو طریقوں میں اختلاف یا تضاد کہاں پیدا ہوتا ہے؟

یہ تمام مختلف نوشتے جو عہد عتیق میں شامل ہیں دراصل مختلف انبیائے اسرائیل کے داخلی تجربات کا اظہار ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں یسعیاہ اور حزقی ایل نبیوں کے مشاہدات ہیں جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے خدا کی ذات کا کائنات کے ہر ذرے میں مشاہدہ کیا۔ اسی مشاہدۂ ربانی کی روشنی میں حزقی ایل نبی نے خدا کی رضا سمجھنے کی کوشش کی اور اس کے بعد رضائے الٰہی کے قانون کو بنی اسرائیل کے سامنے پیش کیا۔ زبور کے مختلف ابواب میں خدائے مطلق کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ گویا یہ ساری کائنات اسی کے بلاواسطہ عمل سے قائم و دائم ہے۔ وہ ہر جگہ موجود ہے اور ہر چیز کے ساتھ ہے۔ باب ۱۳۹ کی چند آیات ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

"[1] اے خداوند! تو میرا اٹھنا بیٹھنا جانتا ہے، تو میرے خیال کو دور سے سمجھ لیتا ہے۔ . . . تو نے مجھے آگے پیچھے سے گھیر رکھا ہے اور تیرا ہاتھ مجھ پر ہے۔ یہ عرفان میرے لیے نہایت عجیب ہے۔ میں تیری روح سے بچ کر کہاں جاؤں یا تیری حضوری سے کدھر بھاگوں؟ اگر آسمان پر چڑھ جاؤں تو تو وہاں ہے۔ اگر میں پاتال میں بستر بچھاؤں تو دیکھ! تو وہاں بھی ہے۔ اگر میں صبح کے پر لگا کر سمندر کی انتہا میں جا بسوں تو وہاں بھی تیرا ہاتھ میری رہنمائی کرے گا۔ اور تیرا دہنا ہاتھ مجھے سنبھالے گا۔ اگر میں کہوں کہ یقیناً تاریکی مجھے چھپا لے گی اور میرے چاروں طرف کا اجالا رات بن جائے گا تو اندھیرا بھی تجھ سے چھپا نہیں سکتا بلکہ رات بھی دن کی مانند روشن ہے۔ اندھیرا اور اجالا دونوں یکساں ہیں کیونکہ میرے دل کو تو نے ہی بنایا۔"

اسی نوشتے میں دوسری جگہ خدا کی معیت اور قرب کے متعلق بھی اظہار موجود ہے۔

"آسمان پر تیرے سوا کون ہے؟ اور زمین پر تیرے سوا میں کسی کا مشتاق نہیں۔ گو میرا جسم اور میرا دل زائل ہو جائیں تو بھی خدا ہمیشہ میرے دل کی قوت اور میرا بخرہ ہے۔" (۷۳: ۲۵-۲۶)

"میرے لیے یہی بھلا ہے کہ خدا کی نزدیکی حاصل کروں۔" (۷۳: ۲۸)

اے خدا! تو میرا خدا ہے۔ میں دل سے تیرا طالب ہوں گا۔ خشک اور پیاسی زمین میں جہاں پانی نہیں میری جان

---

[1] زبور باب ۱۳۹: ۱-۱۳

تیری پیاس اور میرا جسم تیرا مشتاق ہے ۔ ۔ ۔ ۔ تیری شفقت زندگی سے بہتر ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اور میں تیرے پروں کے سایہ میں خوشی مناؤں گا۔ میری جان کو تیری ہی دھن ہے تیرا دہنا ہاتھ مجھے سنبھالتا ہے۔" (: ۱-۹)

اسی طرح کے جذبات محبت بے شمار جگہ مختلف نوشتوں میں بکھرے پڑے ہیں جن کی بنیاد پر یہودیوں کے ہاں تصوف کی عمارت استوار ہوئی۔ اس کی ایک شکل تو وہ ہے جس کا اظہار قبالہ کی شکل میں ہوا لیکن چونکہ یہ چیز بہت بعد کی پیداوار ہے اور اس کی تشکیل میں اسلامی فکر کا کافی حصّہ ہے اس لیے یہ ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ اس کی دوسری شکل وہ ہے جس کا اظہار اسکندریہ میں ہوا اور جس کا بہترین نمایندہ حکیم فیلو (Philo) ہے۔ اس کی زندگی کے متعلق کچھ زیادہ تفصیلات معلوم نہیں۔ اندازہ ہے کہ وہ ۲۰ قبل مسیح کے قریب پیدا ہوا۔ اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اسکندریہ میں گزارا جو اُن دنوں تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا اور جہاں مشرق و مغرب کی حکمتوں کا امتزاج ظہور پذیر ہو رہا تھا۔ فیلو کے سامنے اپنے زمانے کا علمی ماحول تھا جس میں فلسفہ و حکمت ایک طرف اور مذہب دوسری طرف تھا۔ فلسفہ و حکمت کے بیانات اپنے ہوتے ہیں اور مذہب کے حقائق کسی دوسرے لباس کے متقاضی ہوتے ہیں۔ ایک ایسا شخص جو مذہب کو فلسفہ و حکمت کی روشنی میں مطالعہ کرنا چاہے یا فلسفہ و حکمت کے غوامض کو مذہبی ہدایت کے لباس میں پیش کرنا چاہے تو اس کے لیے دونوں کا غائر مطالعہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ تاریخ فلسفہ و دین میں اس حیثیت سے فیلو کا مقام بہت بلند ہے کہ اس نے ان دونوں سرچشموں سے پورا پورا استفادہ کیا۔ اور اپنی حد فکر تک عقل و نقل، فلسفیانہ مسائل اور مذہبی عقائد میں ایک تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس قسم کی کوشش فیلو سے پہلے رواقیوں نے بھی کی تھی۔ اس مکتب فکر کے اکثر فلاسفہ غیر یونانی سامی نسل سے تعلق رکھتے تھے اور اس لیے ان کے فلسفے میں بہت سے تصورات ایسے موجود تھے جو زرتشت اور یہودی مذاہب سے لیے گئے تھے[1]۔ چنانچہ جب فیلو نے اس مقصد کے لیے قلم اٹھایا تو اسے رواقی فلسفے سے بہت مدد ملی

رواقیوں سے پہلے یونانی فلاسفہ کے سامنے عام طور پر نسلی اور جغرافیائی تفریق بہت نمایاں تھی اور بلند و بالا تجریدی مباحث کے باوجود ان کے سامنے خالص انسانی اور عمومی نقطۂ نگاہ کبھی نہ آیا۔ ارسطو کے نزدیک ہر غیر یونانی وحشی اور کم علم تھا لیکن جب بیرونی ممالک سے رابطہ بڑھا اور زرتشتی اور اسرائیلی مذاہب سے روشناس ہونے اور ان کے افکار و روایات سے واقفیت پیدا ہونے کے مواقع میسر آنے تو ان کی یہ تنگ نظری وسعت انسانیت کے تصورات میں آکر ختم ہو گئی۔ اخلاقی اور مذہبی افکار اب خالص یونانی نسلی روایات کے دائرۂ اثر سے بالکل آزاد ہو گئے۔

رواقیوں نے اخلاق اور مذہب کے اصولوں کی پیروی کو خارجی عوامل اور معاشرتی دباؤ سے آزاد کر دیا۔ اب اگر کوئی انسان

---

[1] دیکھیے راقم الحروف کی کتاب "حکمائے قدیم کا فلسفۂ اخلاق" کا باب : رواقی فلسفۂ اخلاق۔

ان اصولوں کی پیروی کرنا چاہیے تو اسے صرف اپنے نفس کی اندرونی گہرائی میں جھانکنے کے سوا اور کسی چیز کی ضرورت نہیں ہر انسان کا قلب اور نفس اس کا بہترین راہنما ہے۔ اگر اسے اپنے اعمال و افعال کے لیے کسی جواز یا پابندی کی حاجت ہے تو یہ چیز اسے خارج سے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اس کے اپنے ضمیر کی آواز، اس کے نفس کا اطمینان اور اس کے قلب کی تصدیق کافی ہے۔ اس کی ذات ایک عمومی قانون اخلاق کا مجسمہ ہے بالکل اسی طرح جس طرح دوسرے افراد۔ اس طرح ایک خالص انسانی یک جہتی اور وحدت کا تصور پیدا ہوا۔ ہر قسم کے اختلافات کے باوجود جو ان کے نزدیک محض خارجی، بے معنی اور عارضی ہیں، ہر انسان بنیادی طور پر دوسرے انسانوں سے ہم آہنگ ہے اور یہی صحیح انسانیت کا نچوڑ ہے۔ اس کا بہترین مظاہرہ تاریخی طور پر یوں ہوتا ہے کہ ایک طرف اپکٹیٹس (Epectetus) ایک غلام اور مارکس اُریلیس (Marcus Aurelius) ایک عظیم الشان رومی حکمران دونوں رواقی ہونے کی حیثیت سے بالکل برابر ہیں۔ انسانی مساوات کا یہ شاندار اصول جو رواقیوں نے زرتشتی اور اسرائیلی مذاہب سے حاصل کیا، رواقیوں کے ذریعہ پہلی دفعہ یونانی فکر میں داخل ہوا اور اس سے مشرق اور مغرب، وحشی اور مہذب کی قدیم تفریق ختم ہونی شروع ہوئی۔ ان کے نزدیک خدا عقل کا ایک کلمۂ تخلیق ہے جس کا مظاہرہ ایک طرف خارجی کائنات میں ہوتا ہے اور دوسری طرف انسان کے داخلی نفس میں جس کے باعث نہ صرف تمام انسان ایک ہی برادری کے مختلف افراد بن جاتے ہیں بلکہ کائنات اور انسانوں میں بھی ایک مربوط رشتہ موجود ہے جو دونوں میں ہم آہنگی قائم کرتا ہے۔ اس طرح انسان اور خدا کے درمیان ایک بلا واسطہ اور براہ راست روحانی تعلق قائم ہوتا ہے جو قدیم یونانی مذہبی روایات میں نظر نہیں آتا۔ یہی تصورات ایک بلند ترین اور عالمگیر مذہب کے قیام کی بنیاد بن سکتے تھے لیکن اس کے لیے جس بنیاد کی ضرورت تھی وہ اسرائیلی نبیوں کے علاوہ کہیں نہ مل سکی۔

مذہب کا یہی انسانی تصور تھا جو رواقیوں سے پہلے اسرائیلی انبیا پیش کر رہے تھے۔ جلاوطنی سے پہلے یہودیوں کے ہاں مذہب کا تصور بہت حد تک نسلی اور قومی تھا، ان کے خیال میں خدا اور بنی اسرائیل کے درمیان ایک خاص قسم کا تعلق تھا اور یہودی خدا کی چہیتی قوم تھی لیکن سیاسی تباہی کے بعد جب یہودی دنیا کے مختلف حصوں میں منتشر ہو گئے تو ان کے انبیا نے مذہب کا ایک عالمگیر نظریہ پیش کرنا شروع کیا جس میں خود یہودیوں کی حیثیت محض توحید خداوندی کے علمبرداروں کی تھی۔ گویا وہ ایک ایسے افراد کا مجموعہ تھی جن کے پاس خدا کے فرامین اور احکام موجود تھے اور جن کی زندگی کا مقصد یہ تھا کہ تمام انسانوں کو اس سے روشناس کرایا جائے۔ مذہبی روایات و رسوم جو بیت المقدس کے ہیکل سے وابستہ تھیں سیاسی تباہی کے باعث اب ممکن نہیں تھیں اس لیے روحانی جذبے کا اظہار اب داخلی اور انفرادی شکل اختیار کرتا گیا۔ چونکہ خارجی ماحول ان کی اجتماعی زندگی کے لیے یکسر ناسازگار تھا اور ان کے روحانی افکار و جذبات کا اظہار معاشرتی زندگی میں ہونا بالکل ناممکن تھا اس لیے ان کی ساری تگ و دو اب فرد کے اندرونی نفس کے ارتقا تک محدود ہو کر رہ گئی۔

ایک زمانہ تھا جب یہودیوں کے نزدیک بلند ترین نصب العین اس دنیا میں حکومتِ الٰہیہ کا قیام تھا جس کا سربراہ حضرت داؤد کی اولاد میں سے کوئی عظیم الشان مسیح ہوگا لیکن جب حالات کی ناسازگاری کے باعث یہ نصب العین محض خواب بے حقیقت بن کر رہ گیا تو انہوں نے اس تصور کو مستقبل کی روحانی زندگی کے ساتھ وابستہ کر لیا۔ ان کا خیال تھا کہ موجودہ زندگی میں بدی اور شر کا غلبہ اتنا شدید ہو چکا ہے کہ اس کی اصلاح ممکن نہیں لیکن ایک ایسا دور آنے والا ہے جب خدا کی مہربانی سے ایک نیک اور دانا آدمی کے ہاتھوں اس کی مکمل اصلاح ہو سکے گی۔ اس مستقبل بعید کے شاندار نصب العین نے بے انتہا مصائب و تکالیف کے باوجود سنبھالے رکھا۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب اور روحانی زندگی کا سارا دار و مدار فرد کی داخلی زندگی تک محدود ہو کر رہ گیا۔ ایک فرد دوسرے افراد سے معاشرے کے ارکان کی حیثیت سے منسلک نہیں اس لیے کہ وہ ایک ہی خدائے مطلق کے ساتھ ایک مضبوط رشتے میں بندھا ہوا ہے۔ جس چیز کی انہیں ضرورت ہے وہ صرف انسانی نفس اور خدائے واحد کا عرفان ہے۔ جس نے اپنے نفس کا عرفان کر لیا اس نے اپنے رب کی حقیقت کو پالیا اور اس طرح وہ ایک انفرادی دائرے کی تنگی سے نکل کر عالمگیر برادری کا رکن بن گیا۔

حکمت و فلسفہ کی یہ دو مختلف روایات آخر کار فیلو کے نظامِ فکر میں آکر ہم آہنگ ہو گئیں۔ اس نے کوشش کی کہ یہودی مذہب کی روح کو یونانی فلسفہ کی زبان میں پیش کرے۔ یہ باہمی داد و ستد تصوف کی تاریخ میں بہت اہمیت کی حامل ہے کیونکہ اس میل سے بعض ایسے تصورات وجود میں آئے جن کی آواز بازگشت عیسائی اور اسلامی تصوف میں آج بھی سنی جا سکتی ہے۔ ان مختلف تصورات میں سب سے زیادہ اہم تصور کلمہ (Logos) ہے جو مختلف شکلوں اور مختلف الفاظ کا جامہ پہنے ہوئے تقریباً ہر صوفی فلسفی کے ہاں پایا جاتا ہے۔ اسلامی تصوف کی تاریخ اور اس کے ارتقا کو سمجھنے کے لیے اس تصور کی تفصیلی تاریخ اور اس کے مضمرات کو سمجھنا ضروری ہے۔

ہرقلیطس

سب سے پہلا شخص جس کے ہاں لوگوس یعنی کلمہ کا تصور ملتا ہے ہرقلیطس (Heraclitus) ہے (۵۳۵ - ۴۷۵ قبل مسیح)۔ وہ پروہتوں کے ایک مشہور خاندان سے تعلق رکھتا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ صاحبِ دل آدمی تھا اس لیے اپنے زمانے کے مذہبی اور سیاسی حالات سے بے حد نالاں، اور اسی بنا پر اس نے اپنے آبائی پیشہ کو ترک کر دیا اور لوگوں کی دینی اور معاشرتی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اس کا کلام مختلف اور مختصر اقوال پر مشتمل ہے اور اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دل میں پیغمبرانہ اصلاح کا جذبہ موجود تھا۔ اس نے اپنے زمانے کے لوگوں پر سخت تنقید کی اور انہیں دعوت دی کہ وہ اس کی بات کو سنیں اور اس کے کلام کی طرف پوری توجہ کریں شاید کہ وہ فلاح حاصل کر سکیں۔ جس پیغام یا کلمہ کا وہ علمبردار ہے وہ کوئی عارضی اور وقتی اہمیت نہیں رکھتا بلکہ وہ حقیقتِ ازلی ہے جو ہر زمانے اور ہر جگہ صحیح اور درست ہے۔ وہ اس صداقت کا جس کو وہ کلمہ کا نام دیتا ہے پیغامبر ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:

"میری طرف نہیں بلکہ کلمہ کو غور سے سنو۔ یہ تسلیم کرنا حکمت ہے کہ تمام اشیاء ایک وحدت میں منسلک ہیں۔ اگرچہ یہ کلمہ ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کے باوجود لوگ اس کو سن کر یوں کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں کہ گویا وہ اس سے واقف نہیں۔ اگرچہ تمام واقعات و حادثات اسی کلمۂ ازلی کے مطابق ظہور پذیر ہوتے ہیں لیکن لوگوں کے اعمال اور افعال سے یوں ظاہر ہوتا ہے کہ وہ گویا اس سے بالکل واقف نہیں اگرچہ میں حقیقت حال سے واقف کرنے کے لیے ہر چیز کی فطرت صحیحہ کو واضح الفاظ میں ان کے سامنے رکھ دیتا ہوں۔ لیکن عام لوگوں کی زندگی کا یہ حال ہے کہ وہ جاگتے ہوئے بھی اپنے اعمال کی حقیقت سے اس طرح غافل ہیں کہ گویا وہ سوئے ہوئے ہیں[۵۱]۔"

یہ الفاظ بقول ورنر جیگر (Werner Jaeger) کسی معلم یا محقق کے نہیں بلکہ ایک ایسے پیغمبر کے معلوم ہوتے ہیں جس کا مدعا محض علمی تحقیق نہیں بلکہ جس کے سامنے ایک عملی مقصد ہے تاکہ وہ لوگوں کو غفلت کی نیند سے بیدار کر سکے۔ اس کے نزدیک دنیا کے انسان دو حصوں میں منقسم ہیں۔ ایک طرف وہ ہیں جو عقل و ہوش کے مالک ہیں یعنی پوری طرح بیدار ہیں اور دوسری طرف انسانوں کی اکثریت ہے جو خواب میں مبتلا اور حقیقت سے بالکل بے خبر ہیں۔ ہرکلیٹس ایک ایسا شخص ہے جو کلمۂ ازلی اور صداقتِ ابدی کا پیغامبر ہے اور اس کے سامنے لوگوں کا ہجوم ہے جو اس سے بالکل بے خبر ہیں حالانکہ ساری کائنات اسی کلمہ کے مطابق ازل سے چل رہی ہے۔ یہی بات اس کی پیغمبرانہ شان کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس کے الفاظ میں ایک طرح کی طنز اور جذبات کی گہرائی اس چیز کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اس کا مقصد محض علمی طور پر کسی فلسفیانہ نتیجہ تک پہنچنا نہیں بلکہ لوگوں کی عملی زندگی کو ان کی موجودہ اور مروجہ حالت سے بدل کر ایک بہتر اور صحیح راستے پر لانا ہے۔ ایک دوسری جگہ وہ کہتا ہے: "حکمت اور صداقت ایک عمومی اور عالمگیر شے ہے . . . . اس لیے ہمیں چاہیئے کہ ہم اس عمومی صداقت کی پیروی کریں۔ اگرچہ یہ کلمہ عالمگیر ہے، عام آدمی اس طرح زندگی بسر کرتے ہیں کہ گویا یہ کلمہ اور صداقت محض انفرادی اور موضوعی ([illegible]) شے ہے[۵۲]۔"

ہرکلیٹس کے نزدیک لوگوس یا کلمہ کی نوعیت اخلاقی اور سیاسی ہے کیونکہ وہ نہ صرف عالمگیر ہے بلکہ مختلف مظاہرات اور موجودات میں ایک بنیادی حقیقت بھی ہے۔ اس کی مثال ایک ریاست کے قانون کی سی ہے جو اس ریاست کے مختلف النوع افراد کو ایک وحدت میں منسلک کرتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کی ماہیت اس طرح کے عارضی اور وقتی قانون سے بالا ہے کیونکہ وہ سب موجودات کی ماہیت مشترکہ ہے اور انسانی نفس[۵۳] اس کی آواز یا ذریعہ اظہار ہے۔ وہ لوگ

---

۵۱ کورن فورڈ، یونانی مذہبی افکار، صفحہ ۷۸ - ۷۹

۵۲ کورن فورڈ، یونانی مذہبی افکار، صفحہ ۷۷، اور ورنر جیگر، ابتدائی یونانی فلاسفہ کا دینیاتی فکر ۱۱۰ - ۱۱۱

۵۳ نفس یونانی لفظ [illegible] کا ترجمہ ہے یعنی صوفیا کی اصطلاح میں انفس قلب۔

جو قلب (نفس) کی آواز پر لبیک کہتے ہیں وہ مجبور ہیں کہ اس چیز کی پیروی سے قوت حاصل کریں جو سب میں مشترک ہے اس طرح جس طرح ایک شہر یا مملکت قانون کے باعث مضبوط ہوتی ہے۔ تمام انسانی قوانین کا سرچشمہ ایک روحانی قانون ہے جو ہر جگہ جاری اور ساری ہے اور سب کے لیے مکتفی اور ہر جگہ فاتح ہے[1]۔ یہ قانونِ خداوندی خارجی فطرت میں بھی کارفرما ہے۔ ایک جگہ وہ کہتا ہے کہ سورج اپنے مقررہ حدود سے تجاوز نہیں کر سکتا اور اسی قانونِ خداوندی کو لوگوں کے پاس پہنچانے کا کام اس نے اپنے ذمہ لیا۔ یہ قانون محض علم طبیعات کی اصطلاح میں واقعی اور فطری قانون ([illegible]) نہیں بلکہ ایک اخلاقی قانون (NORMATIVE) ہے جو انسانوں کے سامنے درستی اور نادرستی، حق و باطل، اچھائی اور برائی کی تمیز پیش کرتا ہے۔ اس کے سامنے ایک وجودِ مطلق کا تصور موجود ہے جس کی حکمت و دانائی کا مظاہرہ قانون یا کلمہ ہے جو خارجی کائنات اور انسانی نفس دونوں کے اندر موجود ہے اور انسانی فلاح کا دارو مدار "اس واحد کی رضا کی پیروی" میں ہے[2]۔

یونانی فکر کی تاریخ میں ہریکلیٹس کا نام منفرد ہے۔ اس نے سقراط اور افلاطون سے پہلے صوفیانہ اور مذہبی رجحانات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی اور کورن فورڈ کی رائے ہے کہ اس کا فلسفہ قدیم یونانی فلاسفۂ فطرت کی مادیت کے خلاف ایک صوفیانہ ردِ عمل تھا[3]۔ اس کے نزدیک علوم و فنون کا اکتساب یا حصول انسان کو حکمت و دانائی سے روشناس نہیں کراتا، علوم طبعی اور ریاضیات خارجی کائنات کے متعلق ناقص اور نامکمل معلومات مہیا کرتے ہیں۔ صحیح حکمت کے حصول کے لیے آغاز خارج سے نہیں بلکہ انسانی نفس سے ہونا چاہیئے کیونکہ حقیقتِ مطلقہ کا صحیح پرتو یہی انسانی نفس ہے۔ چنانچہ اس کا قول ہے کہ "میں نے اپنے نفس کے اندر غوطہ لگا کر حقیقت کو تلاش کیا ہے[4]"۔ ایک دوسری جگہ وہ کہتا ہے کہ ہر انسان میں اپنے داخلی نفس کو جاننے کا ملکہ موجود ہے اس لیے اسے چاہیئے کہ وہ اس کے اندر جھانکے۔ چنانچہ سقراط کی طرح اس نے طبیعی فلاسفہ کی موشگافیوں کے خلاف پُرزور احتجاج کیا اور لوگوں کی توجہ خارج سے ہٹا کر ان کے اپنے نفسوں کی طرف مبذول کی لیکن جہاں سقراط کا مقصد محض اخلاقی تھا، ہریکلیٹس کا مقصد لوگوں کو اس عارضی اور فانی دنیا سے ہٹا کر وحدتِ مطلقہ اور صداقتِ ازلی کی طرف متوجہ کرنا تھا۔ حکمت کا دارو مدار صرف ایک چیز پر ہے ——— اس کلمہ یعنی لوگوس کا علم جو ہر جگہ موجود ہے[5]۔

اس کے بعد رواقیت میں کلمہ کا تصور زیادہ وضاحت سے ملتا ہے اور مؤرخین فلسفہ کا یہ کہنا صحیح ہے کہ رواقی فلسفہ درحقیقت ہریکلیٹس سے بہت زیادہ متاثر ہے۔ انہوں نے ہریکلیٹس کی طرح حقیقتِ مطلقہ اور کلمۂ ازلی کو آگ یا صحیح الفاظ میں نور سے تشبیہ دی جو اس کائنات کا جرثومۂ عقلی (SEMINAL REASON) یا کلمۂ تخلیقی ہے۔ رواقیوں کے

۱؎ کورن فورڈ، صفحہ ۷۹، جیگر، صفحہ ۱۱۵

۲؎ دیکھیے جیگر، صفحہ ۱۲۷

۳؎ دیکھیے انسائیکلوپیڈیا مذہب و اخلاق جلد ۸، صفحہ ۱۳۲ [?]

۴؎ کورن فورڈ، صفحہ ۷۹، نمبر ۱۰۱

۵؎ کورن فورڈ، صفحہ ۷۹، نمبر ۴۱

ہاں اس کلمہ کو دو مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک کلمہ وہ ہے جو حالتِ امکان (POTENTIALITY) میں ہے اور ابھی ظہور پذیر نہیں ہوا اور دوسرا وہ کلمۂ خداوندی جو عالمِ وجود میں ظاہر ہو چکا ہے۔ اس تقسیم سے کلمہ کا ایک نیا اور دوسرا مفہوم یعنی "لفظ" سامنے آگیا۔ اور اس طرح یونانی لوگوس یا کلمہ رواقیوں کے واسطے سے یہودی "کلمہ" سے وابستہ ہو گیا۔ رواقیوں کے نزدیک الفاظ اور تصورات ( ) ایک ہی حقیقت کے دو پہلو تھے اور اسی لیے لوگوس یا کلمہ جب تک "قلب" یا ذہن میں ہے تصور ہے لیکن جب وہ زبان سے ادا ہوتا ہے تو وہی لفظ بن جاتا ہے۔ یہ کلمہ واحد ہونے کے باوجود تمام انسانوں میں مشترک ہے اور اسی کی بنا پر انسانیت کا وحدانی تصور پیدا ہوتا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ رواقیوں کے ہاں یہی لوگوس یعنی کلمہ یا عقل ہی خدا ہے لیکن بعض رواقی مفکرین کے ہاں خدا کی ذات اور اس کلمہ یا عقل کو دو مختلف وجود تسلیم کیا گیا ہے اگرچہ مؤخر الذکر اس کا بہترین مظہر ہے۔ چنانچہ کلینتھیز (Cleanthes) کی مناجات کے مندرجہ ذیل الفاظ قابلِ غور ہیں: "تمام فانی انسانوں کے لیے یہی زیبا ہے کہ وہ تمہیں مخاطب کریں کیونکہ ہم تیری اولاد ہیں اور اس دنیا کی ساری زندہ مخلوق کے مقابلہ پر تیری صورت پر بنائے گئے ہیں۔ اس لیے میں ہمیشہ تیری مناجات کروں گا اور تیری قدرت و طاقت کے راگ الاپوں گا . . . . یہ تم ہی ہو جس نے بے ترتیبی سے ترتیب و نظام پیدا کیا اور ہر چیز کا آخری ملجا و ماویٰ تم ہی ہو کیونکہ تم نے ہی عقلِ واحد (یعنی لوگوس یا کلمہ) قائم کیا جو ابدی زندگی کا حامل ہے . . . . اے خدا انسانوں کے دلوں سے بے وقوفی اور نادانی کو زائل کر اور ان کو توفیق دے کہ وہ حکمت کو پا سکیں کیونکہ تو حکمت و دانائی سے اس کائنات پر فرمانروائی کرتا ہے . . . . فانی انسانوں کے لیے اس سے بہتر کوئی بات نہیں کہ وہ اس لوگوس یعنی عالمگیر قانونِ خداوندی کی تعریف کریں[1]۔"

یہودیوں کے ہاں کلمہ کی تخلیقی قوت کا تصور بہت پرانا ہے جو انہوں نے ایک اور سامی قوم سمیری اور بابلی سے لیا۔ سمیریوں کے ہاں منہ سے نکلا ہوا لفظ یا وعدہ ایک حقیقی وجود تصور ہوتا تھا اور اسی لیے ان کے اوراد اور مناجاتوں میں کلمہ کو دیوتاؤں کے غم و غصہ کا اظہار تصور کیا گیا۔ مثلاً "کلمہ جس نے بلندیوں پر آسمانوں کو ہلا دیا اور جس کے باعث نیچے زمین کانپ اٹھی"۔ کلمہ کا یہی تصور یہودیوں کے ہاں سمیریوں کے زیرِ اثر پیدا ہوا۔ چنانچہ "حکمتِ سلیمان" میں یہواہ کے کلمے کے متعلق مندرجہ ذیل فقرے اس سمیری عقیدہ کی آوازِ بازگشت ہیں:

"تمہارا قادرِ مطلق کلمہ ایک خوفناک سپاہی کی شکل میں عرش و کرسی سے بدقسمت ملک میں اترا، اس کے ہاتھ میں تمہارے حکم کی تیز تلوار تھی اور اس کے اثر سے ہر جگہ موت طاری ہو گئی۔"

---

[1] دیکھیے انسائیکلوپیڈیا مذہب و اخلاق جلد ۸، صفحہ ۲۰۳ ۔ ۱۲۵ اور راقم الحروف کی کتاب "حکمائے قدیم کا فلسفۂ اخلاق" کا باب "رواقی فلسفۂ اخلاق"

زبور (۱۴۷، ۱۵) کے الفاظ: "وہ اپنا حکم زمین پر بھیجتا ہے، اس کا کلام نہایت تیز رو ہے۔" اسی سمیری عقیدہ کا اظہار ہیں۔

سمیریوں اور بابلیوں کے ہاں پانی کو ازلی اصول اوّل کی حیثیت حاصل تھی جس سے تمام اشیاء کی تخلیق ہوئی تخلیقی صورت کا منبع پانی ہی تھا اور پانی کی حقیقی حکمت اور تخلیقی قوت کے لیے ان کے ہاں لفظ ممّو (Mummu) استعمال ہوتا تھا جس کے لغوی معنی "آواز" یا منہ سے نکلے ہوئے کلام یا کلمہ کے ہیں۔ ممّو کو بعد میں ایک مشخص وجود کی شکل دی گئی جس کی تصدیق ایک یونانی مورخ کی کتاب سے ہوتی ہے۔ اس کے بیان کے مطابق ممّو عالم معقولات اور میٹھے پانی کے دیوتا اپسو کا اکلوتا بیٹا ہے۔

سمیری بابلی فلسفے کی رو سے شے کی حقیقت کا دارومدار اس کی صورت پر تھا یعنی ان کے نزدیک خدا کے ذہن میں ہر شے کا ایک تصور تھا اور یہی تصور اس شے کے نام سے ظاہر ہوتا تھا اس طرح تمام علم ایک طرح کا الہام ہے اور اشیاء کی حقیقت ان کے مادی وجود پر نہیں بلکہ ذہنی تصور پر منحصر ہے۔ تمام مادی اور غیر مادی اشیاء کے وجود کا دارومدار پانی کے دیوتا پر ہے جو ممّو ہے اور آفاقی عقل سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ اس طرح ان کے نزدیک یہ تمام کائنات ایک رشتے میں منسلک ہے جس کی بنیاد یہی روحانی تخلیقی عقل ہے۔

اسی بابلی فلسفہ نے پہلے یونانی مفکرین کو متاثر کیا۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ تھیلز نے جو یونانی فلسفہ کا ابوالآباء تصور کیا جاتا ہے اسی فلسفہ کے زیر اثر پانی کو اصول اول تسلیم کیا اور اس کے اولیں پیرووں کے نزدیک یہی آفاقی جوہر (Cosmic Substance) خود عقل، حکمت اور ہم آہنگی کا دوسرا نام ہے۔ اسی طرح ہریکلیٹس کے کلمہ یا قانون حرکت (   ) اور بابلی فلسفہ کے تخلیقی کلمہ یا حکمت میں کافی مماثلت ہے۔[1]

اسی بابلی تصور کے زیر اثر یہودیوں کے ہاں کلام (یا کلمہ) کی تخلیقی قوت کا تصوّر رائج ہوا۔ جلاوطنی کے بعد کی لکھی ہوئی کتابوں میں یہ تاثر صاف جھلکتا ہے۔ مندرجہ ذیل فقرات قابل غور ہیں:

"آسمان خداوند کے کلام سے اور اس کا سارا لشکر اس کے منہ کے دم سے بنا۔" (زبور ۳۳، ۶)

"اور وہ اپنا کلام نازل فرما کر ان کو شفا دیتا ہے۔" (زبور ۱۰۷، ۲۰)

"اسی طرح میرا کلام جو میرے منہ سے نکلتا ہے ہوگا۔ وہ بے انجام میرے پاس واپس نہیں آئے گا بلکہ جو کچھ میری خواہش ہوگی وہ اسے پورا کرے گا اور اس کام میں جس کے لیے میں نے اسے بھیجا مؤثر ہوگا۔" (یسعیاہ ۵۵، ۱۱)

---

[1] سمیری اور بابلی تصور ممّو کے متعلق دیکھئے انسائیکلو پیڈیا مذہب اور اخلاق جلد ۱۲ صفحہ ۷۴۹ - ۷۵۲۔

یہ کلام یا کلمہ آرامی زبان میں میمرا (Memra) کہلانے لگا۔ اس کا مادہ "امر" ہے جس کے لغوی معنی بولنے کے ہیں۔ اور اس لیے میمرا کے معنی لوگوس کی طرح کلمہ کے ہیں لیکن جس میں لوگوس کی طرح "عقل" کا مفہوم شامل نہیں۔ کلمۂ کن جس سے خدا نے کائنات کی تخلیق کی اسی سے ملحقہ تصور ہے۔[1]

میمرا میں تین مختلف تصورات شامل ہیں ــــــ تخلیق، پروردگاری اور الہام۔ خدا کے منہ سے لفظ "کن" نکلا اور کائنات کی تخلیق ہوئی اور پھر اس کی روح یا نغمہ ان چیزوں میں زندگی پیدا کرتا ہے جن کو اس کے کلمہ نے تخلیق کیا اور اس زمین میں بھرپور زندگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ اسی طرح نبیوں پر وحی اور شریعت کا نزول اسی کلمہ کے باعث ہوا۔ عہد عتیق سے کچھ مثالیں اوپر دی گئی ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں کلام یا کلمہ ایک تخلیقی قوت کی حیثیت سے خدا سے ایک علاحدہ وجود تھا۔

اسی طرح بعد میں عہد عتیق کی دوسری کتابوں اور خاص کر صحیفۂ ایوب میں "حکمت" کا تصور ملتا ہے۔
دوسری طرف زرتشتی افکار سے متاثر ہو کر یہودیوں کے ہاں "حکمت" کا تصور ایک مشخص وجود کی حیثیت سے بعض صحیفوں میں نمایاں طور پر ملتا ہے۔ بعض ان صحیفوں کے علاوہ جو موجودہ انجیل میں شامل نہیں ایوب اور امثال میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ ایوب کے اٹھائیسویں باب سے کچھ مثالیں درج کی جاتی ہیں
"خدا اس کی (یعنی حکمت کی) راہ کو جانتا ہے اور اس کی جگہ سے واقف ہے۔ . . . جب اس نے بارش کے لیے قانون اور رعد کی برق کے لیے راستہ ٹھہرایا تب ہی اس نے اسے دیکھا اور اس کا بیان کیا۔ اس نے اسے قائم کیا بلکہ اسے ڈھونڈ نکالا۔" (۲۳، ۲۵ ــ ۲۷)
ستائیسویں آیت میں جن الفاظ کا ترجمہ مروجہ انجیل میں "بیان کیا" درج ہے اس کی جگہ بعض لوگوں نے "مطالعہ کیا" یا "غور کیا" (Studied) کے الفاظ استعمال کئے ہیں اور اس طرح ان فقروں سے کہ خدا نے حکمت کا "مطالعہ کیا" اور اس کو "ڈھونڈ نکالا" (یا دوسری تشریح کے مطابق اس کے علم کا امتحان لیا) یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ "حکمت" نے تخلیق کائنات کا نقشہ اور قوانین مہیا کئے جن کو خدا نے صحیح پایا اور اس کے مطابق یہ کائنات ظہور میں آئی۔
اس نظریہ کی تائید صحیفہ امثال سے ہوتی ہے جو اس وقت لکھا گیا جب یہودیوں کا جلاوطنی کے بعد پہلی مرتبہ زرتشتیوں سے میل جول ہوا۔ کم از کم یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ صحیفہ اس وقت معرض تحریر میں آچکا تھا جب یہودی یونانی فلسفہ سے متاثر ہونا شروع ہوئے۔ اس طرح یہ چیز حتمی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ "حکمت" کا یہ تصور یونانی فکر کے اثرات سے بالکل پاک ہے۔

---

[1] دیکھئے ریکن کی کتاب "اسرائیل کا حکمتی ادب" صفحہ ۲۴۰ - ۲۴۳

امثال کے باب ۸ کی چند آیات درج ذیل ہیں جن میں حکمت کے متعلق تفصیلات بیان کی جارہی ہیں:

"خداوند نے انتظام عالم کے شروع میں اپنی قدیمی صنعتوں سے پہلے مجھے پیدا کیا۔ میں ازل سے یعنی ابتدا ہی سے مقرر ہوئی۔ اس سے پہلے کہ زمین تھی۔ میں اس وقت پیدا ہوئی جب گہراؤ نہ تھا، جب پانی سے بھرے ہوئے چشمے نہیں تھے۔ میں پہاڑوں کے قائم کئے جانے سے پہلے اور ٹیلوں سے پہلے خلق ہوئی جبکہ اس نے ابھی نہ زمین کو بنایا تھا نہ میدانوں کو اور نہ زمین کی خاک کی ابتدا کی تھی۔ جب اس نے آسمان کو قائم کیا میں وہیں تھی۔ جب اس نے سمندر کی سطح پر دائرہ کھینچا، جب اس نے اوپر افلاک کو استوار کیا اور گہراؤ کے سوتے مضبوط ہو گئے، جب اس نے سمندر کی حد ٹھہرائی تاکہ پانی اس کے حکم کو نہ توڑے، جب اس نے زمین کی بنیاد کے نشان لگائے، اس وقت ماہر کاریگر کی مانند میں اس کے پاس تھی اور میں اس کے لیے باعث خوشنودی تھی اور ہمیشہ اس کے حضور شادماں رہتی تھی اور میری خوشنودی بنی آدم کی صحبت میں تھی۔" (۲۲-۳۱)

اس ازلی "حکمت" کے پاس لوگوں کی بھلائی کے لیے کچھ پیغام ہے جو ان پر اکثر اوقات وحی والقا کرتی رہتی ہے مثلاً اسی صحیفہ کے اسی باب کی چند متفرق آیات درج ذیل ہیں:

"اے آدمیو! میں تم کو پکارتی ہوں اور بنی آدم کو آواز دیتی ہوں۔" (۴)

"سنو! کیونکہ میں لطیف باتیں کہوں گی اور میرے لبوں سے راستی کی باتیں نکلیں گی اس لیے کہ میرا منہ سچائی کو بیان کرے گا۔ میرے منہ کی سب باتیں صداقت کی ہیں ..... سمجھنے والے کے لیے وہ سب صاف ہیں اور علم حاصل کرنے والوں کے لیے راست ہیں۔" (۶-۹)

"میں صداقت کی راہ پر انصاف کے راستوں میں چلتی ہوں۔" (۲۰)

"جو مجھ کو پاتا ہے زندگی پاتا ہے۔" (۳۵)

ان مختلف اقتباسات سے چند حقائق واضح طور پر سامنے آجاتے ہیں (۱) تخلیق کائنات سے پہلے خدا نے حکمت کو پیدا کیا تھا (۲) خدا نے اسے اس کائنات کا انتظام کرنے کے لیے مقرر کیا تھا یا خود اس کے انتظام کرنے میں اس کی مددگار تھی (۳) حکمت کی حیثیت ایک ماہر کاریگر کی تھی جس نے اس کائنات کی تخلیق کا نقشہ بنایا اور جسے خدا نے پسند کیا اگرچہ تخلیقی عمل براہ راست خود خدا کا تھا (۴) حکمت کو خدا کے ساتھ رہنے کا شرف حاصل تھا اور جس کی موجودگی خدا کے لیے شادمانی کا باعث تھی (۵) حکمت کے تمام افعال اور اس کا پیغام بنی آدم کے لیے مخصوص ہے وہی زندگی اور صداقت کے طریقوں کی نشاندہی کرتی ہے (۶) حکمت کے پیغام کی خصوصیت راستی، صداقت، علم، انصاف یا شریعت ہیں۔ (باقی آئندہ)